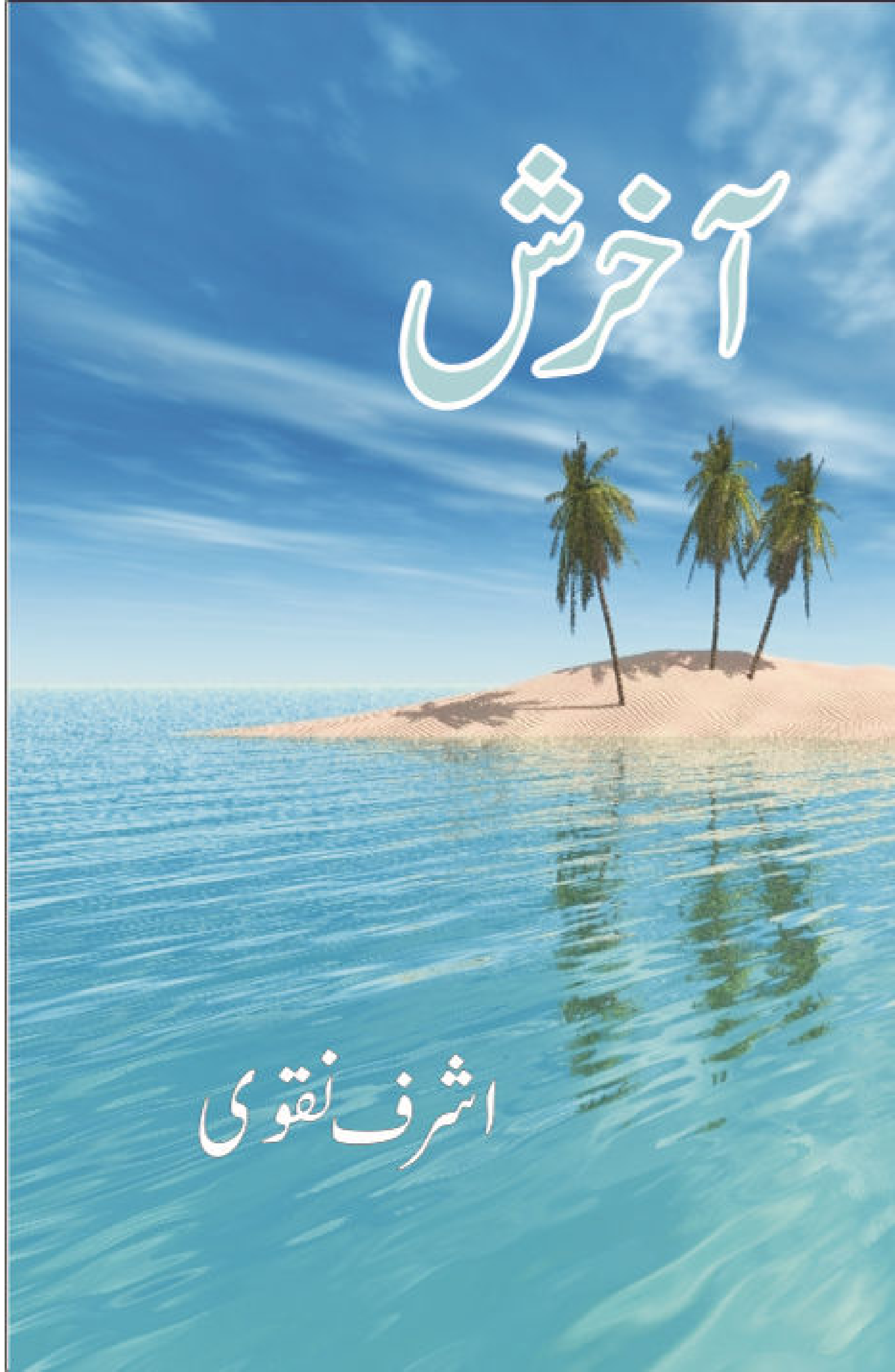


آخرش

اشرف نقوی

اِن دِنوں شہرِ ادب میں جس طرف نظر اُٹھائیے شعراء کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ یعنی ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں والا معاملہ ہے۔ ان میں اکثریت تو اُن شعراء کی ہے جو شاعری کا مستقبل مخدوش بنانے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں مگر صورتِ حال اِتنی مایوس کُن بھی نہیں کہ شاعری سے منہ موڑ لیا جائے۔ اِس بھیڑ میں بھی کبھی کبھی کوئی آواز ایسی ہوتی ہے جس کو سُننے کو جی چاہتا ہے، کبھی کبھی ایسا کلام بھی سامنے آتا ہے جس کو پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ شعراء کے اِس قبیلے کا ایک فرد اشرف نقوی ہے۔

اشرف نقوی کی شاعری پڑھتے ہوئے پہلے تو آپ چونکتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مسحور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا روایتی ڈکشن پس منظر میں رہتا ہے اور اس کا جدید طرزِ احساس اس کے جذبے اور خلوص کے ساتھ آمیز ہو کر قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ وہ محبت کی شاعری بھی کرتا ہے تو یوں کہ محبت کی شاعری کرنے والوں میں نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ اگر وہ اِسی سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے اپنا شعری سفر جاری رکھے تو بہت جلد وہ اہم شعراء کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

۲۴ اپریل ۲۰۰۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخرش

اشرف نقوی

الحرمین پبلی کیشنز، شیخوپورہ

Book Name __ Aakherash

Poet:________ Ashraf Naqvi

Seletcors: Arshad Naeem, Naveed Raza

Arranged by: Hassanain Naqvi

Addition: Second

Publishing year: 2024

Quantity: 500

Price: Rs. 600/-

نام کتاب: آخرش

شاعر : اشرف نقوی

انتخاب : ارشد نعیم، نوید رضا

اہتمام : حسنین نقوی

اشاعت: باردوم

سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : -/۶۰۰ روپے

الحرمین پبلی کیشنز شیخو پورہ، لاہور

انتساب

اپنے اہلِ خانہ کے نام

حُسنِ ترتیب

اے مخاطب

شعر گوئی کا عمل اپنے اصیل عناصر کے اعتبار سے خیر و خبر کی سی زندگی بخش فضا سے مسلسل اور متواتر ہم آہنگی کا نام ہے۔ میں شعر و ناشعر کے مابین تفاوت یا دوئی کی لکیر کو اِسی قلمِ خیر رساں کے موئے قلم کا شاہکار تصور کرتا ہوں۔ غزل کی روایت اپنے احوال و آثار کے حدود میں تاریخ و تہذیب کی ہم قدم بھی ہے اور ہم سر بھی۔ یوں دیکھا جائے تو غزل کہنا محض رسم نبھانا یا آواز میں آواز ملانا نہیں، بلکہ یہ تو زندگی کی گواہی دینے کا نام ہے، ایسی گواہی جو کہ شعر و وقت کے مابین موجود تعلق میں اضافے اور اثبات کا بیانیہ ہو اور جو تخلیقی عمل کو محض جذبات نگاری کے سرسری پن سے بلند تر کرتی ہوئی احساس کی سریت اور فکر کے اعماق تک لے جائے۔ بظاہر یہ غزل کی عجیب سی تعریف ہے، جسے نصابی اور مروجہ ضابطوں سے خاص علاقہ نہیں، یعنی نہ تو یہاں محض عورت سے مکالمے کو غزل کہا گیا اور نہ ہی شکاری کتوں کے نرغے میں آئے ہوئے غزال کی آہ و بکا کو غزل سے تعبیر کیا گیا، یہاں تک کہ جدید شاعر نے تو کائنات کے دو اہم رخوں، یعنی داخل اور خارج کی از کار رفتہ تقسیم کو بھی قلم زد کر دیا، دنیا کے نقشے پر اپنے داخل اور اپنے خارج خود دریافت کیے، اور اِن کے مابین آمد و رفت کا سامان بھی کیا۔ یوں دیکھا جائے تو جیسے جیسے شعری پیراے میں نو بہ نو امکانات ظہور پذیر ہوئے، سکہ بند نقاد کی اُلجھن دو چند ہوگئی۔ ایسے میں شاعر نے، نقاد کی اعصابی جھنجھلاہٹ کا سدِ باب کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا، بلکہ قلمروِ سخن کو وسعت شناس کیا، اور خوب کیا۔

نوجوان شاعر اشرف نقوی کا زیرِ نظر مجموعۂ کلام حرمتِ حرف کی پاسداری کا ایسا مکالمہ ہے، جس کے حضور و غیاب قابل دید بھی ہیں اور قابل داد بھی۔ ہر عہد کی طرح، موجودہ دور میں بھی شاعر کو کچھ سوالات کا سامنا ہے، یعنی یہ کہ ادب کا زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ عصری شعور کیا چیز

ہے اور شعر کے لیے کتنی ناگزیر ہے؟ کیا کرافٹس منشپ ایک غیر تخلیقی جوہر ہے؟ اردو ادب کس تیزی کے ساتھ کلیشے میں تبدیل ہو رہا ہے اور ایسے میں ادیب پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟، وغیرہم۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ادب اور زندگی میں کوئی ایسا تعلق نہیں جسے راست یا معکوس کی نسبتوں سے جانچا جا سکے، اِس تعلق کی نسبت تو لامتناہی ہے اور جمالیات ہی اِس مذکورہ نسبت کی بنیاد گزار ہے۔ یعنی سیاسی، سماجی یا عصری رجحانات کی بازگشت جمالیات کی چھلنی میں چھن کر ہی مقامِ شعر کو پہنچ سکتی ہے، بصورتِ دیگر ناشعر کا یہ غوغا شوروشر میں اضافے کا باعث ہو تو ہو، تاریخ کی روک ٹوک کے سامنے ٹھہرنے سے قاصر ہے۔

شعر میں تمثال گری کا عمل، فکرواحساس کی پیش کش کے لیے بھی ضروری سمجھا گیا ہے اور پیش رفت کے لیے بھی۔ اِسی ذریعے سے ادب میں نظریات تک کی پیچیدگیوں کو زبانِ حال میسر آئی ہے اور فرقِ من وتُو سمجھ میں آنے لگا ہے۔ بالفاظِ دیگر تخلیق کارزمان ومکان سے تعارف اور تعلق کی بنیاد اپنی جداگانہ تراشیدہ تمثیلوں میں پیش کرتا ہے۔ یوں اپنی ابتدا و انتہا میں زندگی کا کوئی بڑا تجربہ ہو یا تاریخ و مذھب سے اکتساب کا شغل، سب کچھ شعری تناظر میں بھی ایک فطری مظہر کے طور پر اہم نظر آنے لگتا ہے۔ اشرف نقوی نے اپنی محبوب علامتوں کی زبان میں اپنے تجربے کے تحفظ کا سامان کیا ہے، اُس کے تمثال وخیال میں تکرار کی مدبرانہ خو، کچھ اور نہیں، ایک منضبط شعری فضا کے معمار ہی کا متبادل ہے۔ فی الوقت شاعر کی اِس استقامت کو تنوع مخالف رویہ نہیں کہا جا سکتا، اِس لیے کہ اُسے انہماک و استغراق کی جو کیفیت نصیب ہے، اس بنا پر عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ تحرک آثار اور تغیر پسند ثابت ہو، لہٰذا مجھ ایسے قاری کے لیے اشرف نقوی کی وارداتِ شعر سے ہمہ وقت آگاہ رہنا ناگزیر ہے کہ یہ آگاہی میرے لیے خود آگاہی کا وسیلہ بھی ہے۔ یہ قیاس کہ موجودہ اردو غزل کلیشے ہی کی ایک شکل ہے، خاصا توجہ طلب ہے۔ غزل پر یہ دشنام طرازی صرف اِس معرکے کے شکست خوردہ عناصر کی طرف سے نہیں، بلکہ ایسی نابغہء عصر شخصیات کی طرف سے بھی ہے، جن کی زندگیاں وقف ہی غزل کے لیے ہیں، جنھیں غزل کی خدمت کرتے اور نسل در نسل تربیت کا موجب بنے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اول الذکر قبیل

سے جو کوئی بھی متعلق ہو، یہاں خارج از بحث ہے۔ موءخرالذکر میں کچھ تو ایسے ہیں، کلیشے کے ضمن میں جن کے مبحث زیادہ تر مفردات و مرکبات کی جمع تفریق کے گرد گھومتے ہیں۔ تخلیق شعر کے لمحوں میں زبان کے انتخاب کو اِس حد تک شعوری عمل بنا دینا کہ زنبیلِ شعر میں مفردات ہی نظر آئیں، کسی اور رخ سے قابل ذکر تو سکتا ہے مگر کلیشے سے گلو خلاصی کے لیے مجوزہ نسخہ نا قابل فہم ہے۔ پھر کچھ ایسے بھی ہیں جن کی دانست میں لسانی تجربات ہی کلیشے سے نجات دہندہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ مجوزہ لسانی تشکیلات کس نئی ابجد کے تابع ہوں، حرف و ہندسہ کی کیا گرامر ہو، کیا جیومٹری ہو۔ عوام کی زبان ادب کی زبان ہو، یا ادب کا لحن عوام کا لحن، پھر یہ کہ اِن دونوں الحان میں باڈر کا کیا جواز اور پیمانہ ہو۔ چونکہ جواب کسی کے پاس نہیں۔ اِسی لیے اپنی اپنی تجاوزات کو تشکیلات کہا جانے لگا ہے۔ اِس عمل میں فائدہ (دنیاوی) شاعر کا ہوا ہے اور نقصان شاعری کا۔ مصرع، جسے حجرہء درویش کے مانند روشن ہونا چاہیے تھا، تماشا گاہ کا ہم اسم بنا دیا گیا ہے۔ میر یاد آگئے ہیں:

دیکھ سیلاب اِس بیاباں کا
کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے

یہاں اِن باتوں کا ذکر شاید بے محل نہ ہو، اِس لیے کہ آگے چل کر اشرف نقوی سے بھی یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اُس نے، بزعمِ خود ہی، کتنے لفظ نئے بنائے، بزورِ بازو کتنوں کو خراب کیا۔ پوچھنے والوں کو یہ غرض نہیں کہ لفظ بے چارہ تو احساس کی منتقلی کا سطحی اور عبوری منہج ہے، مستقل اور مسلسل حیثیت تو معانی کو حاصل ہے، جس کے اظہار و ابلاغ سے لیکر اخفا و التوا تک کئی ایک نکتہ ہائے نقد و جود میں آچکے ہیں، لیکن معانی ہے کہ ہنوز طلسم کا طلسم ہے۔ شعر تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ہئیت اور لسان کی حدیں ختم ہوں، یہاں تو لسانی بد ہئیتی کے مرتکب افراد بھی اپنے سیاہ وسفید پر دھڑا دھڑ ادبِ عالیہ کی مہریں لگائے چلے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ لسانی تشکیلات کا سب حاصل حصول استہزائے مطلق کے گوشواروں میں خوب کھپ چکا ہے، ضرورت اِس بات کی ہے کہ کلیشے کو لسانی نہیں فکری تشکیلات سے متزلزل کیا جائے۔ یہاں فکر سے مراد ایسی فکر ہرگز نہیں جو

فلسفہ، منطق یا سائینس کی لے پالک ہو، بلکہ ایسی فکر ہے جو تخلیق ادب کے لیے مطلوبہ آزادی اور خود مختاری کو بروئے کار لا سکے، جس کے مآخذات اور منابع مٹی کی طرح تہ بہ تہ اور پانی کی طرح موج درموج ہوں، جو زمین و جبین کی طرح بندہء خاکی کے جملہ رازہائے بندگی کی امانت داراور اخروی اور دائمی حقیقتوں کی ناز بردار ہو۔ اپنی اثر پزیری میں خالص ہو، جیسے کہ فطرت خود۔ محض ڈکشن کی ڈھال اندرون و بیرون کے خالی پن کی محافظ نہیں ہو سکتی۔ شعریات کے کُل کرافٹ سے مملو معانی، ایسی نگہِ نگہدار کا حلیف ہوتا ہے، جس سے دل و دماغ، اکائی کی صورت میں کارگر، علیحدگی کی رسوائی سے بچ جاتے ہیں، مگر طویل ریاضت کا یہ ثمرہ ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتا۔ اشرف نقوی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے اور دیکھیے کہ شاعر نے کس کس معانی میں معلوم و نامعلوم کی ترویج و تجدید میں حصّہ لیا ہے:

سنا رہا ہے کہانی یہی غبار مرا
ملا ہوا ہے کسی دشت سے دیار مرا

کیا خبر تجھ کو جانتا ہی نہ ہو
جو ستارہ ترے خلاف ہوا

آئنہ بد گمان تھا مجھ سے
گر کے ٹوٹا تو انکشاف ہوا

تمام دشت و دمن میرے آگے آگے چلے
اور اِن کے پیچھے مرا قافلہ روانہ ہوا

خاک ہوں اشرف، اور اُڑ کر
اپنے سر تک پہنچا ہوں

کرافٹ کی بات چلی ہے تو عرض کرتا چلوں کہ کرافٹ کسی کاریگری کا سابقہ لاحقہ نہیں، بلکہ شعر کے بین السطور آہنگ کی اُس دریافت کا نام ہے جو خیال و احساس و جذبہ سے آمیز ہونے کے لیے ہی وجود میں آتا ہے اور شعر کو خبرِ محض کی خجالت سے پاک کرتا ہے۔ فرہنگِ شعر کے

اندر اِس کا کوئی جدا گانہ مطلب نہیں ۔لہٰذا کرافٹ کو شعر سے الگ قضیہ قرار دینا درست نہیں ۔مشاعرہ پسندوں کا مرغوب ،کمزور مصرع سطحِ قرطاس پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہوتا ہے ۔اپنے اپنے طور پر اِس بوجھ کو کم کرتے رہنا چاہیے ۔مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ جن کے نزدیک عمل تخلیق محض جسموں کی مجرمانہ سرگوشی کا نام ہے، وہ تو یہ بوجھ کم کرنے سے رہے، یہ مسلک و منصب اُنھی لوگوں کا ہے جنھوں نے شعر کو روحوں کے مابین محرمانہ خاموشی کا نام دیا اور اِسے روحانی اور روہی سرگرمی کے درجے پر رکھا۔اشرف نقوی نے عین اُس وقت اپنے مجموعہء کلام کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے جب اسلوب کی دیوی چلمن کی اوٹ سے چھب دکھلاتی ملتفت دکھائی دی ہے ۔احیاء وارتقا پر ایمان رکھنے والوں کے لیے چلمنوں کی سی رکاوٹیں دور کر دینا چنداں مشکل نہیں ۔ یہاں کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

ایک عالم وجود میں آیا
خاک کو خاک میں ملانے سے

مری وحشت کے سائے ہیں جو اشرف
مرے قد کے برابر آ رہے ہیں

ہم لوگ اگر گھر میں چراغوں کو جگہ دیں
جل جائیں حسد سے درو دیوار ہمارے

نہیں کچھ بھی مگر ہونے کا اپنے
مجھے کچھ کچھ گماں ہونے لگا ہے

آنکھ میں جو کبھی نہیں اترا
خواب وہ بھی بچا کے رکھا ہے

وقت کو بھی کتاب میں ہم نے
مور کا پر بنا کے رکھا ہے

کُن کا سارا وقار مٹی سے
ہے خدا کو بھی پیار مٹی سے

ہوں ادھورا ، مجھے مکمل کر
مجھ کو مالک ! گزار مٹی سے

وقت کے ساتھ ساتھ شعر کی تعبیر و تشریح کے بھی نئے نئے معیارات سامنے آئے ہیں۔سائنس کی ہوش ربا ایجادات و انکشافات نے جہاں معلومات و اطلاعات کے ذخائر میں اضافہ کیا ہے ، وہاں بنی نوع انسان کے گرد اپنی گھمبیرتا کا گھیرا تنگ کر دیا ہے۔کچھ سائنس پسند ناقدین کا خیال ہے کہ تخلیق کار اِن ایجادات کے مرکزے کے گرد گھومتا دکھائی دے، بالکل ایسے جیسے الیکڑان اپنے مرکز نیوکلیس کے گرد گردش میں ہے۔شاعر کو الیکٹران کی رفتار سے گھمانا کوئی دانشمندانہ اقدام نہیں۔ایک حد تک تو یہ ہوا ہے کہ سائنس کی تھیوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نظمیں ،غزلیں اور افسانے لکھے گئے ہیں،اور اِن کی پذیرائی کے لیے مکاتیب بھی وجود میں لائے جا چکے ہیں۔یہاں ایک لمحے کو رک کر سوچنے کی ضرورت ہے کہ سائنسی تھیوریاں جنھیں بیشتر خفیف و لطیف مفروضات کی بنیاد پر کوئی شکل دی جاتی ہے، حتمی یا قطعی نہیں ہوتیں۔مفروضہ رد ہونے پر تھیوری ہوا ہو جاتی ہے۔اربابِ سائنس اِس ناکامی کو ناکامی نہیں گردانتے، بلکہ نئی توانائی کے ساتھ ترمیم و اضافہ کی منزل سر کرتے ہیں۔رہا معاملہ اِن آتی جاتی تھیوریوں پر لکھے جانے والے افسانوں، نظموں،غزلوں کا،تو وہ اپنی RELEVANCE سے محروم ہو جاتے ہیں اور یوں تخلیق کار کی نظریں درآمدات کی اگلی کھیپ پر لگ جاتی ہیں۔لہٰذا متنِ شعر کو گرفت کرنے کا متذکرہ ڈسپلن کوئی دوررس رہنمائی فراہم کرنے سے قاصر رہا ہے۔یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ شعر کی افادیت کے یکسر عدم افادیت میں بدل جانے کی یہی ایک وجہ نہیں۔تنقید دشمن،تخلیق دشمن دیگر وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔وژن کے محدودات، روایت کی عدم تفہیم، مقامیت کی جوڑ توڑ، پاپولر پوئٹری سمیت متعدد CONSTRAINTS ہیں،جن سے نبرد آزما ہوئے بغیر تصورِ شعر میں کجی رہ جاتی ہے۔آفاقیت کو جانے والے راستوں سے پتھر ہٹانا ذرا اور طرح کی طلب ہے، جس کا وظیفہ بھی ذرا اور طرح سے کرنا ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سخن ور ایک ہی واردات کی توسیع میں سلسلہ پیما ہوتا ہے،کبھی بقا کے روبرو اور کبھی فنا کے حضور، مرکزیت مخالف عناصر کی ضرر رسانی سے محفوظ، یہی ایک

واردات عبودیت کا انتخاب ہوتی ہے۔آفاقیت کے بعض مدرس میرے ممدوحین میں بھی شامل ہیں۔ یہ حضرات کائنات پر بات کرتے ہوئے انسان کی ذات کو غیر اہم قرار دے کر اِسے ایوانِ ادب سے بے دخل کر دینے کے حامی ہیں۔اِن کے نزدیک انسان کا حوالہ اپنے جملہ احوال و تجربات سمیت بڑے ادب کی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہے۔انسان کو بزمِ کائنات سے چلتا کرنے کی خواہش اپنی فروگزاشت میں اُسی تصور کی ہم پایہ ہے جس کے مطابق مصنف کو متن سے نکال باہر کر دیا گیا، یا خدا کی موت کا جاں خراش و جہاں خراش اعلان سنائی دیا۔نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔اب خمیازے کے طور پر نئے نئے دم چھلوں کے ساتھ مذکورہ تھیوریوں کے مقامی VERSION سامنے آرہے ہیں۔غالب کا شعر ملاحظہ کیجئے اور دیکھیے کس طرح انسان کی بظاہر صیغہء واحد میں نظر آنے والی واردات اجتماعی کرب کا اشاریہ بن جاتی ہے۔

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

زیرِ نظر کتاب میں اشرف نقوی نے بھی اپنے باطن کے آدمی کو ظاہری چکا چوند کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔عصری موشگافیوں کے ردوقبول کا معاملہ اِسی شخص پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ یہ شخص خدا کا زیادہ مقرب بندہ واقع ہوا ہے۔سخن آباد کے قدیم و جدید آثار بتاتے ہیں کہ توفیق و عطا کی منزل پر باطن کے اِس آدمی کا وظیفہ زیادہ موثر اور دستِ دعا زیادہ لائق لحاظ مانا گیا ہے۔

شاہین عباس

۵ جنوری، ۲۰۰۶ء

ذکر کرتی رہے زباں تیرا
لب پہ ہر دم رہے بیاں تیرا

گرچہ تیرا نشان کوئی نہیں
ہے مگر ہر جگہ نشاں تیرا

تیری قدرت سے کچھ نہیں باہر
ہے مکاں تیرا ، لامکاں تیرا

رہنما تُو ہی ہر سفر میں ہے
منزلیں تیری ، کارواں تیرا

میری معراج ہے فقط اِس میں
ہو جبیں میری ، آستاں تیرا

تیری جانب سے خیر و شر کا وجود
ہر یقیں تیرا ، ہر گماں تیرا

خوش نصیبی ہے تیرے اشرف کی
دل بنا اِس کا آشیاں تیرا

آپؐ کے جو غلام ہیں آقاؐ
وہ جہاں کے اِمام ہیں آقاؐ

میرے دامن میں نذر کرنے کو
بس درود و سلام ہیں آقاؐ

میری ہستی کی تیرہ شب کے لیے
آپؐ ماہِ تمام ہیں آقاؐ

مشعلِ راہ سیرتِ اطہر
نقش ، نقشِ دوام ہیں آقاؐ

آپؐ سرور ہیں، آپؐ ہی رہبر
آپؐ خیرالانام ہیں آقاؐ

اِک پیالہ عطا ہو کوثر سے
ہم بہت تشنہ کام ہیں آقاؐ

اپنی قسمت پہ کیوں نہ رشک کریں
آپؐ کے ہم غلام ہیں آقاؐ

اِن کو تاثیر کچھ عطا کیجئے
لفظ اشرف کے خام ہیں آقاؐ

دیوار روشنی کی ہے ، در روشنی کا ہے
کربل میں خیمہ زن ہے جو گھر روشنی کا ہے

کچھ اِس طرح سے پیاس بُجھی اِک چراغ کی
حلقوم اب بھی خون میں تر روشنی کا ہے

نیزوں پہ لگ رہا تھا سروں کی بہار سے
صحرائے تیرگی میں شجر روشنی کا ہے

بخشا وقار جس کو محمد ﷺ کی آل نے
وہ کربلا تو اب بھی نگر روشنی کا ہے

حُر کا جبیں جُھکانا درِ اہلِ بیت پر
اِک روشنی کے نام سفر روشنی کا ہے

اشکِ غمِ حُسینؑ کی تاثیر دیکھیے
ہاتھوں میں میرے آج ہُنر روشنی کا ہے

اشرف یہ سارا فیض ہے ذکرِ حُسینؑ کا
دامن میں میرے آج بھی زر روشنی کا ہے

❁❁❁❁❁

چراغ جان کے یونہی جلا لیا گیا تھا
ہمیں بھی طاق کی زینت بنا لیا گیا تھا

تمہارے لمس سے محظوظ کس طرح ہوتے
کہ ہم کو خواب سے باہر بلا لیا گیا تھا

اِسی لیے تو ابھی تک میں نامکمل ہوں
ادھورا چاک سے مجھ کو اٹھا لیا گیا تھا

تھے صرف ہم ہی جو رکھتے تھے دل بھی دنیا بھی
یوں آگ پانی کو باہم ملا لیا گیا تھا

ابھی تلک ہیں اُسی کے اثر میں ہم اشرف
جو نغمہ وصل کا خلوت میں گا لیا گیا تھا

❁❁❁❁❁

ہوں کیوں نہ پشیماں در و دیوار ہمارے
ملتے ہیں کسی دشت سے آثار ہمارے

ہم لوگ اگر گھر میں چراغوں کو جگہ دیں
جل جائیں حسد سے در و دیوار ہمارے

وہ جنس گراں ہم ہیں کہ بازارِ جہاں میں
ڈھونڈے سے نہیں ملتے خریدار ہمارے

مدت سے یہ اک دل، کہ جو دل بن نہیں پایا
آیا ہے مگر کام کئی بار ہمارے

گو نقش ہوئے جاتے ہیں ہم آبِ رواں پر
کُھلتے نہیں دریاؤں پہ اسرار ہمارے

اندر کو رہی یونہی جو آنکھوں کی روانی
کر جائے گی کچھ خوابوں کو بے کار ہمارے

گو صورتِ دریا بڑی مدت سے رواں ہیں
اُترا ہی نہیں کوئی کبھی پار ہمارے

ہم شام کے منظر میں ستاروں کی طرح ہیں
اشرف ہیں اندھیرے بھی چمک دار ہمارے

کچھ کارِ ہنر کوزہ گرا میرے ، دکھا بھی
مٹی ہوں، مجھے گوندھ، مجھے چاک پہ لا بھی

سورج سے مری دوستی جس دن سے ہوئی ہے
اُس دن سے خفا مجھ سے ہے جگنو بھی، دیا بھی

رہنا ہی نہیں مجھ کو ترے خواب کی زینت
ہونا ہے کسی روز مجھے جلوہ نما بھی

دل ہم نے جسے ہجر سے آباد کیا ہے
ممکن ہے کسی روز بنے وصل سرا بھی

بھٹکا ہوا راہی ہوں سرِ دشت تمنا
بھُولا ہوا ہوں صدیوں سے میں اپنا پتا بھی

تھکتا نہیں اشرف میں کبھی لمبے سفر سے
ہوجاتا ہوں گھر بیٹھے کبھی آبلہ پا بھی

زخم در زخم ہے یادوں کا خزینہ دل میں
ہم نے آباد کیا ایک مدینہ دل میں

شام ہوتے ہی بھنور گھیرنے لگ جاتے ہیں
ڈوب جاتا ہے کسی شب کا سفینہ دل میں

روز اِس دشت میں کربل سی بپا ہوتی ہے
روز آتا ہے محرّم کا مہینہ دل میں

منکشف مجھ پہ وہ شاید میرا باطن کر دے
آنکھ کی راہ سے اترا ہے جو زینہ دل میں

اِن ہی دو چیزوں سے غم سارے سنبھالے جائیں
ایک ترتیب ہو ، اور ایک قرینہ دل میں

آنکھ کی راہ سے آنے لگا باہر اشرف
وہ جو مدت سے تھا اشکوں کا دفینہ دل میں

سنا رہا ہے کہانی یہی غبار مِرا
مِلا ہوا ہے کسی دشت سے دیار مِرا

رگوں میں ناچ رہا ہے فشارِ خوں بن کر
مرے جنوں پہ نہیں کچھ بھی اختیار مِرا

ہوا کے دل میں تھی مجھ سے نہ جانے کیا پرخاش
کہ دشت بھر میں اُڑاتی رہی غبار مِرا

ہے کیا بعید کہ میں طور تک بھی جا پہنچوں
خدا کو ہو بھی تو سکتا ہے انتظار مِرا

میں وہ کہانی ہوں تم جس میں طول چاہو گے
تمھیں پسند نہ آئے گا اختصار مِرا

اور اب تو مجھ کو اِسی بات پر ہے ناز اشرف
کہ اپنے آپ میں ہونے لگا شمار مِرا

وصل کی شام شبِ ہجر میں تحلیل ہوئی
تب کہیں جا کے مرے عشق کی تکمیل ہوئی

آ پڑا میری ہی دیوار کا سایہ مجھ پر
دھوپ میرے لیے یوں چھاؤں میں تبدیل ہوئی

میری آنکھوں پہ بھی غلبہ تھا کسی چہرے کا
لوحِ دل پر بھی کسی اسم کی تنزیل ہوئی

نیند کے چاک پہ رکھا مجھے کوزہ گر نے
عالمِ خواب میں گویا میری تکمیل ہوئی

رفتہ رفتہ ہی مری آنکھ میں اترا پانی
رفتہ رفتہ یہ نظر پھیل کے اک جھیل ہوئی

نیند تو آنکھ میں در آئی کبھی کی اشرف
بعد مدت کے مگر خواب کی ترسیل ہوئی

❁❁❁❁❁

منظر میں کہاں چچتی ہے تصویر ہماری
ہم خواب ہیں اور اُلٹی ہے تعبیر ہماری

دریاؤں سے کچھ ربط ہوا اتنا زیادہ
پانی پہ لکھی لگتی ہے تقدیر ہماری

مسمار کیے جاتے ہیں معمار ہی ہم کو
کب جانے مکمل کریں تعمیر ہماری

اے وقت ! اِسے اپنی کسی موج پہ لکھ لے
مٹ جائے کہیں ہم سے نہ تحریر ہماری

ہم ذات میں اپنی کسی صحرا کی طرح ہیں
ہو پائے گی تم سے کہاں تسخیر ہماری

ڈوبیں گے کبھی وقت کے دریا میں جو اشرف
در آئے گی لہروں میں بھی تاثیر ہماری

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

چلی ہے خود سے عجب ایک چال میں نے بھی
دیا ہے ہجر کو رنگِ وصال میں نے بھی

اُدھر وہ رویا ہے فرقت میں میری، اور اِدھر
گزارا یاد میں اُس کی یہ سال میں نے بھی

زمانہ ساز تھے دونوں کہ رسمِ دنیا کا
خیال اُس نے بھی رکھا، خیال میں نے بھی

میں اُس کے دل میں رہا اور اُسے خبر نہ ہوئی
محبتوں میں کیا یہ کمال میں نے بھی

نصیب گرچہ تھے دونوں کے ایک سے اشرف
عروج اُس نے بھی دیکھا، زوال میں نے بھی

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

کیا ہے تیری محبت نے جب سے گھر مجھ میں
لگا ہے کھلنے نیا آگہی کا در مجھ میں

یہ ہجر ہی تو ہے تیرے وصال کا حاصل
اِسی چراغ کو جلنا ہے عمر بھر مجھ میں

کہ تم سے پہلے بھی ویران ایک بستی تھی
تمہارے بعد بھی اجڑا ہے اک نگر مجھ میں

شبِ سیاہ نے گرچہ ستارہ چھین لیا
لگی ہے پھوٹنے پھر بھی نئی سحر مجھ میں

میں اپنی ذات میں ہوں دشتِ بیکراں اشرف
ہے اک خیال کا جاری ابھی سفر مجھ میں

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

بزمِ کون و مکاں سے آگے بھی
وہ ہے وہم و گماں سے آگے بھی

ڈھونڈتے ہو جہان میں اُس کو
وہ تو ہے لامکاں سے آگے بھی

ہجر سے ہجر تک سفر اپنا
امتحاں ، امتحاں سے آگے بھی

آنکھ دریا میں ڈوبنے والو !
اک بھنور ہے یہاں سے آگے بھی

میری آنکھوں میں رک گیا ہے کیوں
آ ذرا ، اِس مکاں سے آگے بھی

دیکھتا ہوں میں خود کو چلتے ہوئے
رات بھر کہکشاں سے آگے بھی

میں بشر ہوں ، یہ ہے مرا رتبہ
میں گیا آسماں سے آگے بھی

اک بیاباں ہے درد کا اشرف
اِس دیارِ فغاں سے آگے بھی

❁❁❁❁❁

اک دل ہے، ایک جان ہے رختِ سفر مرا
میرا یہ کل جہان ہے رختِ سفر مرا

زنجیر بن کے پاؤں سے لپٹی ہے یہ زمین
اور اس پہ آسمان ہے رختِ سفر مرا

دریا و دشت اب مرے اعداء کی صف میں ہیں
گویا اک امتحان ہے رختِ سفر مرا

رکھے ہوئے ہے آج بھی اپنے حصار میں
میرے لیے امان ہے رختِ سفر مرا

اشرف یقیں بنا کے لیے پھر رہا ہوں ساتھ
کیا دل نشیں گمان ہے رختِ سفر مرا

جس دن سے وفاؤں کے طلب گار ہوئے ہم
اپنے ہی لیے باعثِ آزار ہوئے ہم

اک دشت سے اِس دل کو جدا کرنے کی دھن میں
دیوار اٹھاتے ہوئے دیوار ہوئے ہم

اے دستِ ہنر تیرا ہی اعجاز ہے شاید
بننے بھی نہیں پائے کہ مسمار ہوئے ہم

اک عمر تلک ہم نے لکھے اپنے قصیدے
اک عمر کے بعد اپنے عزادار ہوئے ہم

مت پوچھ چراغوں کو بجھانے کی لگن میں
کس درجہ ہواؤں کے طرف دار ہوئے ہم

اعزاز یہ ایسے ہی نہیں مل گیا صاحب!
کٹوائے ہیں بازو تو علمدار ہوئے ہم

اشرف نہیں راس آئی تمنا کی اسیری
ہر بار مگر پھر بھی گرفتار ہوئے ہم

مجھ کو مرے وجود سے باہر نکال کے
رکھنے لگا وہ دیکھیے مجھ کو سنبھال کے

معیارِ دوستی ہی نہیں سخت کچھ مرا
کرتا ہوں دشمنی بھی بہت دیکھ بھال کے

اندازہ کچھ نہیں تھا مجھے اُس کی پیاس کا
پچھتا رہا ہوں دشت میں دریا کو ڈال کے

کرنے لگے ہو چارہ گرو! سعئ رائیگاں
عادی ہمارے زخم نہیں اندمال کے

تم خواب جس کو کہتے ہو، وہ خواب ہی نہیں
اک روگ ہے جو رکھا ہے آنکھوں نے پال کے

اشرف سخن کے نام پہ سب کر چکے نثار
ہم نے لٹا دیے سبھی موتی خیال کے

اپنی پلکوں پہ ستاروں کو پرونے والا
ہے کوئی شخص مری یاد میں رونے والا

کشتیِ جاں کو سمندر میں اتارا میں نے
ناخدا ورنہ تھا ساحل پہ ڈبونے والا

دل کسی اور ہی منظر میں نظر آئے گا
یہ ستارا نہیں آفاق میں کھونے والا

دشت و دریا میں نہ ہو کوئی بھی رشتہ جیسے
وہ کسی طور بھی میرا نہیں ہونے والا

روز بچے میرے حسرت سے مجھے دیکھتے ہیں
روز آتا ہے محلے میں کھلونے والا

ریگِ صحرا کی طرح خشک ہیں آنکھیں اشرف
کوئی دریا بھی نہیں اِن کو بھگونے والا

میرے ہونے کی ہے موجود نشانی مجھ میں
روز لیتی ہے جنم کوئی کہانی مجھ میں

جانے کس رو میں یونہی بہتا چلا جاتا ہوں
ایک مدت سے ہے دریا کی روانی مجھ میں

میں کہ ویسے ہی کسی دشت کا سرمایہ تھا
اور تجھ کو بھی تھی کچھ خاک اڑانی مجھ میں

زیرِ آب آنے لگا دل کا علاقہ سارا
اِس قدر ٹپکا مری آنکھ کا پانی مجھ میں

تیری خوشبو کی طلب میں یہ بدن چھوڑ دیا
اب مہکنا ہے تجھے رات کی رانی مجھ میں

اندر اندر جو یہ خوشیوں کی کرن پھوٹی ہے
آج اتری ہے کوئی شام سہانی مجھ میں

لفظ در لفظ ہوں حیرت کا صحیفہ اشرف
اور پوشیدہ ہے اک بابِ معانی مجھ میں

جب سے مجھے تجھ سے اختلاف ہوا
یوں لگا خود سے انحراف ہوا

کیا خبر تجھ کو جانتا ہی نہ ہو
جو ستارہ ترے خلاف ہوا

میری ہستی میں ہے نہاں کوئی
مجھ پہ وحشت میں انکشاف ہوا

مدّعی میں تھا، میں ہی منصف تھا
فیصلہ جب مرے خلاف ہوا

آئینہ بد گمان تھا مجھ سے
گر کے ٹوٹا تو انکشاف ہوا

آ گئی آنکھ میں بھی طغیانی
دل کے دریا میں بھی شگاف ہوا

ہم جو اپنی زمیں پہ زندہ ہیں
کس گمان و یقیں پہ زندہ ہیں

گُم ہوئے ایسی حیرتوں میں ہم
اب جہاں ہیں، وہیں پہ زندہ ہیں

حسرتِ دید ہے کہ مرتے نہیں
وعدۂ دلنشیں پہ زندہ ہیں

خواب جو آنکھ سے رہے اوجھل
وہ یقیناً کہیں پہ زندہ ہیں

کچھ تعلق ہے تیرے در سے اِنہیں
جو نشاں اِس جبیں پہ زندہ ہیں

کیا جئیں گے مدار سے ہٹ کر
ہم تو اشرف یہیں پہ زندہ ہیں

یہ جو آنکھوں میں ہے دیا روشن
کاش! رکھے اِسے خدا روشن

لب پہ آیات پھول بن کے کھلیں
اور ہاتھوں پہ ہو دعا روشن

آنکھ میں اک فرات بہتا ہوا
اور ہونٹوں پہ کربلا روشن

عکس در عکس حیرتیں پھیلیں
جب ہُوا دل کا آئینہ روشن

روشنی تھی بس ایک چہرے کی
اور کچھ بھی وہاں نہ تھا روشن

آسماں پھر اِسی خیال میں ہے
اِس زمیں پر کرے وہ کیا روشن

دل میں منزل کی رکھ لگن اشرف
پھر ترے ہوں گے نقشِ پا روشن

کب نکلوں گا پتھر سے
پوچھوں اپنے آزر سے

میری حقیقت مجھ پہ کھلی
پاؤں کی اک اک ٹھوکر سے

دھرتی ہوں اور دور ہوں میں
آج بھی اپنے محور سے

بات کرے گی خاک مری
آج مرے کوزہ گر سے

آج کی شب پھر ایک دیا
ہٹ جائے گا منظر سے

اپنی ذات سے باہر ہوں
اپنے اندر کے ڈر سے

اشرف سو کر اٹھیں گے
اک دن خاک کے بستر سے

جب سے بازی ہاری ہے
ایک عجب سرشاری ہے

وہ بھی ہم پر قرض ہوئی
جتنی عمر گزاری ہے

اپنے آپ میں گم رہنا
کیا تقدیر ہماری ہے

بھڑکی اور بجھانے سے
دل میں جو چنگاری ہے

آج کی رات چراغوں پر
لگتا ہے کچھ بھاری ہے

سب سے ہنس ہنس کر ملنا
رسمِ دنیا داری ہے

پھول کا صحرا میں کھِلنا
گلشن سے غداری ہے

دیوانوں نے وحشت بھی
تیرے نام پہ واری ہے

آنکھوں میں ہیں خواب بھرے
نیند سے بھی بیزاری ہے

دے گا خود تاثیر اِسے
جس نے غزل اتاری ہے

اشرف وعدہ کر کے وہ
ملنے سے انکاری ہے

آنکھ جو پیاسی رہ جاتی ہے
ایک اُداسی رہ جاتی ہے

دل سے لب تک آتے آتے
بات ذرا سی رہ جاتی ہے

کم ہو کر بھی درد کی شدّت
اچھی خاصی رہ جاتی ہے

❁❁❁❁❁

تارا ہے افلاک میں گم
میں ہوں اپنی خاک میں گم

دل کا دشت نہ ہو جائے
اُس چشمِ نم ناک می گم

آنکھ سے ٹپکا اور ہوا
اِک موتی خاشاک میں گم

ہوتے ہوتے ہوگیا ہوں
کوزہ گر کے چاک میں گم

میری وحشت اب مجھ کو
کر دشتِ اِدراک میں گم

کتنے ہی فرعون ہوئے
وقت کی اُڑتی خاک میں گم

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

مرے یقیں، نہ تمہارے گماں میں آیا ہے
کہ جو حساب دلِ دوستاں میں آیا ہے

میں خود ہی بن گیا دیوار، در بناتے ہوئے
مرا وجود عجب امتحاں میں آیا ہے

بس ایک شب نے چراغوں سے دشمنی کی تھی
پھر اُس کے بعد اندھیرا جہاں میں آیا ہے

تمہارے جانے کا غم ہے، نہ ہے خوشی کوئی
تمہارا غم بھی غمِ رائیگاں میں آیا ہے

بھٹک رہا ہے عجب دشتِ بے قراری میں
یہ دل، کہ جب سے تمہاری اماں میں آیا ہے

ہیں جس کی کون و مکاں بھی نشانیاں اشرف
وہ بے نشان بھلا کب نشاں میں آیا ہے

❁❁❁❁❁

”کُن“ کا سارا وقار مٹی سے
ہے خدا کو بھی پیار مٹی سے

بچھتی جاتی ہے پاؤں کے نیچے
سیکھیے انکسار مٹی سے

میں زمیں سے ہوں ، یہ زمیں مجھ سے
یوں جڑے دل کے تار مٹی سے

ہوں ادھورا ، مجھے مکمل کر
مجھ کو مالک ! گزار مٹی سے

ڈھل گئی جب سے شکل انساں میں
اُٹھ رہے ہیں شرار مٹی سے

اُڑ کے اک روز سر پہ آئے گی
کیوں اُلجھتے ہو یار ! مٹی سے

جب بھی چاہا میں رو لیا اشرف
مل کے دیوانہ وار مٹی سے

❁❁❁❁❁

صورتِ ربط یوں نکالیں گے
دل کو ہم دشت سے ملالیں گے

کانچ سا دل کہاں پہ رکھو گے
لوگ پتھر اگر اٹھالیں گے

تم بھی سورج کو سامنے رکھنا
ہم بھی اپنا دیا جلالیں گے

لوگ ویسے بھی آزماتے ہیں
لوگ ایسے بھی آزمالیں گے

کیا خبر تھی کہ آئینہ گر بھی
آئینوں کو ہدف بنالیں گے

بات وہ جو کبھی ہوئی ہی نہیں
ہم اُسی بات کا مزا لیں گے

اپنی حیرت کو جانچنے کے لیے
آئینے ، آئینے اٹھالیں گے

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

مجھ کو اُس نے شمار میں رکھا
یعنی اپنے حصار میں رکھا

ایک وعدے پہ عمر بھر اُس نے
مجھ کو اپنے مدار میں رکھا

اک سجایا ہے ہم نے پلکوں پر
اک ستارہ غبار میں رکھا

زیست نے عمر بھر ہمیں مصروف
درد کے کاروبار میں رکھا

آئینہ دل کا ٹوٹنے کے لیے
پتھروں کے دیار میں رکھا

❁❁❁❁❁

ہجر میں کیا ہے، اور وصال میں کیا
چھوڑ، رکھا ہے اِس سوال میں کیا

آنکھ سرشار ، مسکراتے لب
کوئی آیا ترے خیال میں کیا

وقت نے نقش سب بدل ڈالے
رہ گیا میرے خد و خال میں کیا

اب جو تقسیم کرچیوں میں ہوا
آئینہ محو تھا جمال میں کیا

زخم دل کا ہے کیوں ہرا اب تک
کچھ رکاوٹ ہے اندمال میں کیا

آبلہ پائی ، دشت اور وحشت
ہے یہی عشق کے مآل میں کیا

موج در موج ہے روانی مری
آئے دریا مری مثال میں کیا

رہ گیا ہے بدن ہی پاس مرے
اور اشرف میں لاؤں ڈھال میں کیا

ہر طرف ہے گمانِ آئینہ
یہ جہاں ہے ، جہانِ آئینہ

میں ہوں محرومِ عکس مدت سے
کہہ رہی ہے زبانِ آئینہ

مستند وقت کی عدالت میں
آج بھی ہے بیانِ آئینہ

زخم سہتے ہیں ، مسکراتے ہیں
ہم تمنا گرانِ آئینہ

ایک ہی عکس میرے ہر سُو ہے
میں ہوں گویا دکانِ آئینہ

فکرِ موت و حیات میں گُم تھا
ہر بشر اپنی ذات میں گُم تھا

میرے چہرے سے بات کیا کرتا
آئینہ شش جہات میں گُم تھا

اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر جانا
میں عبث کائنات میں گُم تھا

پیاس ہی پیاس تھی کنارے پر
اور پانی فرات میں گُم تھا

جس دیے کو ہوا سے لڑنا تھا
وہ ہی فکرِ ممات میں گُم تھا

مجھ کو آسانیاں میسّر تھیں
دل مگر مشکلات میں گُم تھا

رات اشرف میں اک ستارے کی
پوچھ مت ، کن صفات میں گُم تھا

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

جاگتا ہوں کہ سو رہا ہوں میں
منکشف خود پہ ہو رہا ہوں میں

میری آنکھوں میں یہ جو پانی ہے
اِس میں دنیا ڈبو رہا ہوں میں

اس سے پیکر بناؤں گا اپنا
یہ جو مٹی بھگو رہا ہوں میں

میرے اندر جو ایک صحرا ہے
اُسی صحرا میں کھو رہا ہوں میں

جو ستارہ نہیں رہا میرا
اُس ستارے کا ہو رہا ہوں میں

زندگانی کے نام پر اشرف
بوجھ یہ کس کا ڈھو رہا ہوں میں

❁❁❁❁❁

کیسے کیسے عذاب رکھتا ہوں
ہو کے دریا سراب رکھتا ہوں

خواب ٹوٹے جو کوئی بھی میرا
کرچیوں کا حساب رکھتا ہوں

ایک خط کھینچتا ہوں دریا پر
نقش اِک زیرِ آب رکھتا ہوں

اپنے دل کی کتاب میں یادیں
مثل برگِ گلاب رکھتا ہوں

دوریوں میں بھی اک ستارے کو
رات بھر ہمرکاب رکھتا ہوں

بار گاہِ خیال میں اشرف
لفظ کو بار یاب رکھتا ہوں

❁❁❁❁❁

دوستی اُس کی اگرچہ ہے پرانی مجھ سے
پھر بھی دریا نے طلب کی ہے نشانی مجھ سے

میں کہ ڈوبا ہوں تو سینے پہ لیے پھرتی ہے
کتنی مانوس ہے لہروں کی روانی مجھ سے

اُڑتے بادل میری آنکھوں میں اتر آتے ہیں
اور دریا بھی طلب کرتا ہے پانی مجھ سے

میرے لہجے میں تھی تاثیر کچھ ایسی، شب بھر
وقت سنتا ہی رہا اپنی کہانی مجھ سے

لفظ نازل ہوں اگر دل پہ غزل کی صورت
بات کرنے چلے آتے ہیں معانی مجھ سے

وہ حکایت، کہ جو تحریرِ سرِ مژگاں ہے
کاش! سن لیتا کوئی میری زبانی مجھ سے

بات کرتے ہوئے لہجے میں تھکن بولتی ہے
چھن گئی عشق میں سب شعلہ بیانی مجھ سے

وہ ستارہ جو فلک پر ہے فروزاں اشرف
آخرِ شب کر ہی گیا نقل مکانی مجھ سے

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

دل سے دل تک سفر کیا ہم نے
اِس خرابے کو گھر کیا ہم نے

مٹ گئے ہم ، مگر غنیمت ہے
دشتِ ہستی کو سر کیا ہم نے

اک ستارے کو کر لیا خورشید
ایک شب کو سحر کیا ہم نے

اِس سے پہلے کہ آنکھ پتھراتی
خواب کو در بدر کیا ہم نے

تجھ کو دل سے نکالنا تھا کٹھن
کام یہ بھی مگر کیا ہم نے

زندگی ! دیکھ نام پر تیرے
جانے کیا کیا بسر کیا ہم نے

ایک مدت چلے تو ہم پہ کھُلا
دائروں میں سفر کیا ہم نے

آئینے کو جلَو میں حیرت کے
عکس کا مستقر کیا ہم نے

وہ کہ پتھر مثال تھا اشرف
اُس پہ پھر بھی اثر کیا ہم نے

❁❁❁❁❁

آنکھ لگتی نہیں لگانے سے
رات گزرے گی کس بہانے سے

ایک عالم وجود میں آیا
خاک کو خاک میں ملانے سے

کبھی ، دو انتہائیں ملتی نہیں
ایک دریا پہ پُل بنانے سے

اِس جہاں کا نظام رکتا نہیں
میرے آنے سے، میرے جانے سے

کیا بچے گا اگر نکالو گے
میرا کردار اِس فسانے سے

جو ستارہ تھا آنکھ میں پنہاں
کیا ہوا خاک میں ملانے سے

❁❁❁❁❁

جب تک میں ترے خواب کے منظر میں رہوں گا
دنیا میں نہیں ، عالم محشر میں رہوں گا

جب دشت بلائے گا تو جانا ہی پڑے گا
مر جاؤں گا یونہی جو پڑا گھر میں رہوں گا

گو آئینہ خانے سے نہیں میرے مرا اسم
میں عکس کی صورت کسی منظر میں رہوں گا

پھر دستِ ہنر کوئی مرے نقش سنوارے
کب تک میں مقید یونہی پتھر میں رہوں گا

مر کر مجھے جینے کا ہنر آتا ہے اشرف
مر کر بھی میں زندہ مہ و اختر میں رہوں گا

ہجر ہے یا وصال ہے سائیں
یہ محبت وبال ہے سائیں

جیسا تشنہ لبی سے حال مرا
ویسا دریا کا حال ہے سائیں

کیا فقیری ہے اور کیا شاہی
کیا عروج و زوال ہے سائیں

دل غموں کا غبار اُڑاتا ہوا
ایک دشتِ ملال ہے سائیں

زیست اُلجھی ہے یا ہتھیلی پر
اک لکیروں کا جال ہے سائیں

اور اُس کی مثال کوئی نہیں
آپ اپنی مثال ہے سائیں

دل میں اک درد سا جگاتی ہے
یہ جو بادِ شمال ہے سائیں

حسبِ سابق یہ سال اپنے لیے
سالِ حزن و ملال ہے سائیں

وہ نہ سمجھا ہے، نہ سمجھے گا اشارہ میرا
جانے کس دیس میں جا نکلے ستارہ میرا

یہ جو خورشید مرے در پہ چلا آیا ہے
خاک کو اس کی ہے درکار شرارہ میرا

ایک عالم ہے جو حیرت سے مجھے دیکھتا ہے
رنگ کس موج میں یہ تو نے نکھارا میرا

دشت سے آئی صدا، کس کا جنوں تازہ ہے
میں جہاں پر تھا، وہیں سے یہ پکارا، میرا

وہ تو دریاؤں کو پہلو میں لیے پھرتا ہے
ساتھ اُس کو ہو بھلا کیسے گوارا میرا

بس اُسی خط پہ مری لہریں مجھے چھوڑتی ہیں
مجھ سے ملتا ہے جہاں آ کے کنارا میرا

چاند سورج ہیں مرے گھر کی ضرورت اشرف
ایک جگنو سے نہیں ہوتا گزارا میرا

❁❁❁❁❁

اک خواب کی مانند حقیقت تھی ہماری
دریا تھے ، مگر دشت سی صورت تھی ہماری

اِس درجہ یگانہ ہوئے ہم اپنے جنوں میں
ہر دشت میں پہنچی ہوئی وحشت تھی ہماری

کیا ہو گیا جو آج ہیں صحرا سے مراسم
کل تک کئی دریاؤں سے نسبت تھی ہماری

رکھ لیتے تھے انگارے دہکتے ہوئے ، مُنہ میں
بچپن میں یہ معصوم سی عادت تھی ہماری

کہنے کو تھے گمنام ، مگر بابِ وفا میں
بڑھ کر کہیں فرہاد سے شہرت تھی ہماری

بازارِ محبت میں خریدا نہ کسی نے
اِس درجہ زیادہ تو نہ قیمت تھی ہماری

اشرف وہ کیے رازِ عیاں ہم پہ جنوں نے
حیرت میں کئی روز سے حیرت تھی ہماری

❁❁❁❁❁

تیرے در تک پہنچا ہوں
یا محشر تک پہنچا ہوں

تیرا خواب ہوں، مشکل سے
تیری نظر تک پہنچا ہوں

ٹوٹنے اور بکھرنے کو
خود پتھر تک پہنچا ہوں

اک تعبیر کی خواہش میں
خواب نگر تک پہنچا ہوں

جان کی بازی ہاری تو
بال و پر تک پہنچا ہوں

خاک ہوں اشرف اور اُڑ کر
اپنے سر تک پہنچا ہوں

❁❁❁❁❁

زباں سے نکلی تو لب تک صدا نہیں پہنچی
کبھی فلک پہ مری التجا نہیں پہنچی

تمہارے ہجر میں ہجرت کا بوجھ اٹھائے ہوئے
کہاں کہاں پہ مری خاکِ پا نہیں پہنچی

تمہاری یاد فروزاں تھی ہر اندھیرے میں
یہ اور بات کہ دل تک ضیا نہیں پہنچی

ہمارے ہاتھ ازل سے اٹھے ہوئے ہیں، مگر
قبولیت کے نگر میں دعا نہیں پہنچی

پہنچ گئی ہے صدا میری سارے عالم تک
جہاں پہنچنی تھی میری نوا ، نہیں پہنچی

❁❁❁❁❁

مجھ پہ بس اِتنی سی عطا کردے
تُو مجھے صاحبِ اَنا کردے

اک نظر، میرے دل پہ ایک نظر
میں کہ پتھر ہوں، آئینہ کردے

اشک ہوں آنکھ میں مقیّد ہوں
کوئی رو کر مجھے رِہا کر دے

یہ بھٹکتے ہوئے نظر کے چراغ
منزلوں کا اِنہیں دیا کردے

مجھ کو دے ڈالے جسم و جاں سے فراغ
اور صحراؤں کی ہوا کر دے

میری تقدیر میں بھی خالق نور
کوئی جگنو ، کوئی دِیا کر دے

تو جو چاہے تو مجھ کو بخشے دوام
تو جو چاہے مجھے فنا کر دے

دل کے سب زخم بھر گئے اشرف
کوئی پھر سے اِنھیں ہرا کر دے

❁❁❁❁❁

❀❀❀❀❀

خواب آنکھوں میں بچا کر رکھا
یہ دیا ہم نے جلا کر رکھا

جانے کب اِس کی ضرورت پڑ جائے
ہم نے مقتل کو سجا کر رکھا

بن گیا چہرہ علامت غم کی
لاکھ اشکوں کو چھپا کر رکھا

آخر آنکھوں سے نکل ہی آیا
وہ ستارہ جو چھپا کر رکھا

یاد کرنے کے لیے لازم تھا
اِس لیے تجھ کو بھلا کر رکھا

❀❀❀❀❀

❁❁❁❁❁

زمیں تا آسماں رکھا ہوا ہے
ترا غم جانِ جاں رکھا ہوا ہے

ہمارا حوصلہ ہے، ہم نے دل میں
سمندر کو نہاں رکھا ہوا ہے

خوشی کا ایک ہی لمحہ بچا تھا
سو وہ زیرِ فغاں رکھا ہوا ہے

تمہاری یاد کا زہراب اب بھی
میانِ جسم و جاں رکھا ہوا ہے

ابھی تک اک شکستہ سا تعلق
ہمارے درمیاں رکھا ہوا ہے

ابھی اِس آنکھ میں پانی بہت ہے
ابھی دریا رواں رکھا ہوا ہے

رہا ہے دل کہاں پہلو میں اشرف
فقط دل کا نشاں رکھا ہوا ہے

❁❁❁❁❁

ہم جو آنکھوں میں خواب رکھتے ہیں
خواب کیا، بس عذاب رکھتے ہیں

یوں ہے دریا ہمارے پہلو میں
دشت جیسے سراب رکھتے ہیں

یہ جو پانی ہے آنکھ کا ، اِس سے
دل کو ہم زیرِ آب رکھتے ہیں

دیکھ لیجیے مرے لہو کے چراغ
کس قدر آب و تاب رکھتے ہیں

وہ جو ڈرتے ہیں اپنی صورت سے
آئینوں پر نقاب رکھتے ہیں

لڑنے والے بقا کی جنگ اشرف
نقش مثل حباب رکھتے ہیں

❁❁❁❁❁

یوں ادا عشق کا تاوان کیا جائے گا
دل کا نقصان پہ نقصان کیا جائے گا

اک ستارے کو کیا جائے گا دل سے رخصت
ایک خورشید کو مہمان کیا جائے گا

شام آنگن میں اُتر آئی ہے بانہیں کھولے
آج گھر میں اسے مہمان کیا جائے گا

پھونک ڈالیں گے یقینا یہ کسی دامن کو
گر چراغوں کو پریشان کیا جائے گا

ہم،کہ بے چہرہ ہرا ک دور میں ٹھہرے اشرف
دے کے صورت ہمیں حیران کیا جائے گا

❁❁❁❁❁

جو عجب خواب ہمیں دن میں دکھائے گئے تھے
جانے کس شہرِ طلسمات سے لائے گئے تھے

یہ جو دریا سا رواں آنکھ میں تم دیکھتے ہو
جب ہوئے راکھ تو ہم اِس میں بہائے گئے تھے

یہ زمیں رکھ دی گئی تاج کی صورت سر پر
اور ستارے میرے قدموں میں بچھائے گئے تھے

مجھ کو ڈھونڈو گے اگر دل میں تو مل جاؤں گا
میرے آثار اِسی دشت میں پائے گئے تھے

مسترد اُس نے کیا اُن کو بَیک جُنبشِ لب
وہ جو کچھ نکتے مرے حق میں اٹھائے گئے تھے

جلتے سورج نے کیا رخ اُسی جانب اشرف
جس طرف کو میری دیوار کے سائے گئے تھے

کیا زمانے کو بھلا دوں میں نشانی اپنی
سطحِ قرطاس پہ اُتری نہ کہانی اپنی

دل و دریا میں کوئی ربط جو پایا جاتا
آنکھ بھر دیکھتے پھر ہم بھی روانی اپنی

خاک ہونے کا ہنر یونہی نہیں آیا ہے
ہم نے اک عمر تلک خاک ہے چھانی اپنی

کیا وہاں اب بھی محبت کے کنول کھلتے ہیں
گزرا کرتی تھی جہاں شام سہانی اپنی

آگ پانی کو ملاتے ہوئے باہم ہم کو
خاک میں آ ہی گئی خاک ملانی اپنی

جب ہوا نے ہمیں مسمار کیا تو اشرف
ریت سے پڑ گئی دیوار اٹھانی اپنی

جب اَنا کا شکار تھے ہم لوگ
اپنے ہاتھوں ہی خوار تھے ہم لوگ

ایک سایہ تھا اور کچھ بھی نہیں
جس پہ ہر دم نثار تھے ہم لوگ

جن دنوں اختیار ہم سے چھنا
برسرِ اقتدار تھے ہم لوگ

دشت سے تھی مشابہت ، یعنی
ایک اُجڑا دیار تھے ہم لوگ

کوہِ رنج والم سروں پر تھا
اور نحیف و نزار تھے ہم لوگ

ہم کو اُترن سمجھ کے پھینک دیا
کیا زمانے پہ بار تھے ہم لوگ

اب کھنڈر بن چکے ہیں ہم اشرف
ورنہ کیا شاندار تھے ہم لوگ

صبح گردش ہے، شام گردش ہے
ہم ستارے ہیں، کام گردش ہے

وقت ہی دوست ، وقت ہی دشمن
بس اِسی شے کا نام گردش ہے

آنکھ کی راہ تم جہاں پہنچے
وہ تو دل کی غلام گردش ہے

تو ازل سے رواں ابد کی طرف
تجھ کو حاصل دوام گردش ہے

زندگی اور موت میں اشرف
فاصلے کا ہی نام گردش ہے

❁❁❁❁❁

چلی ہے شہرِ تمنا میں وہ ہوا اب کے
کہ بجھ گیا ہے امیدوں کا ہر دیا اب کے

سزائے درد ملی ہے تو ہے قبول ہمیں
کسی بھی در پہ نہیں کرنی التجا اب کے

بھنور کی زد سے جو نکلی تو کشتیِ جاں کو
لگا ڈبونے کناروں پہ ناخدا اب کے

ہواؤں کی کوئی سازش اسے بجھا نہ سکی
مرا چراغ ہی طوفان میں جلا اب کے

سحر سے نکلے ہوئے تھے جو، اُن پرندوں کو
اُڑا کے لے گئی جانے کہاں ہوا اب کے

مَیں اپنے ہاتھ اُٹھاؤں تو کس طرح اشرف
بچھڑ رہی ہے مرے لب سے ہر دعا اب کے

❁❁❁❁❁

✿✿✿✿✿

دل کو غم ہے ہمارے کب صاحب!
آنکھ روتی ہے بے سبب صاحب!

ہم نے اُس وقت دل جلایا تھا
دیپ کوئی نہیں تھا جب صاحب!

لوگ پیاسے کھڑے کنارے پر
اور دریا تھا جاں بہ لب صاحب!

جی رہے ہیں جہاں میں ، جینے کا
جن کو آتا نہیں ہے ڈھب صاحب!

لا رہے ہو چراغ آندھی میں
کر رہے ہو یہ کیا غضب صاحب!

ایک بار اُس سے مانگ کر دیکھو
وہ جو دیتا ہے بے طلب صاحب!

اُس کی ذات وصفات کے آگے
نام میرا ، نہ کچھ نسب صاحب!

اپنے بچوں کی خیر مانگتا ہوں
اپنے مالک سے روز و شب صاحب!

باعثِ فخر ہے ہمیں اشرف
عشق میں جو ملے لقب صاحب!

اک کارِ دشوار لگا
عشق ہمیں آزار لگا

دوریٔ منزل کیا کم تھی
رستہ بھی دیوار لگا

ہم سب جس میں بِکتے ہیں
دنیا وہ بازار لگا

آنکھ میں ڈوبنے والوں کو
ساحل بھی منجدھار لگا

عشق میں عام سا چہرہ بھی
حسن کا اک شہکار لگا

صحن میں کیسا پھول کِھلا
خوشبو کا انبار لگا

جتنا مَیں تعمیر ہوا
اُتنا ہی مسمار لگا

ذرا بھی دل میں وحشت ہے ؟ نہیں تو
تو کیا راحت ہی راحت ہے ؟ نہیں تو

بطورِ ہم سفر ، دل کے سفر میں
تجھے میری ضرورت ہے ؟ نہیں تو

مجھے صحرا نے پھر آواز دی ہے
مری مجنوں سی حالت ہے ؟ نہیں تو

میں جس آزار سے گزرا ہوں ہر پل
اُسے سننے کی فرصت ہے ؟ نہیں تو

تو بزمِ غیر میں ہے گو معزز
تری اپنوں میں عزت ہے ؟ نہیں تو

بہت اونچی ہوا میں اُڑ رہے ہو
فلک چھونے کی طاقت ہے ؟ نہیں تو

سخن جو آگیا اشرف زباں پر
اُسے کہنے کی ہمت ہے ؟ نہیں تو

یونہی آنکھوں میں آ گئے آنسو
سارے منظر پہ چھا گئے آنسو

آنکھ چھلکی تو آنکھ سے باہر
آب جُو سی بنا گئے آنسو

غمِ دوراں میں اِس قدر روئے
یاد تیری دلا گئے آنسو

کھل کے روتے نہ ہم تو مر جاتے
دوست ! ہم کو بچا گئے آنسو

بارشوں کے لیے ضروری تھے
بادلوں میں سما گئے آنسو

منکشف مجھ پہ اور کیا ہوتا
راز سارے بتا گئے آنسو

اب ہے صحرا کی ریت آنکھوں میں
روٹھ کر ہم سے کیا گئے آنسو

چاہے دل یا جان لگا
کام میں اپنا دھیان لگا

خاموشی کی دستک سُن
دیواروں پر کان لگا

جو مضمون لکھا دل پر
اُس پر کچھ عنوان لگا

میرے نقش بدلنے پر
آئینہ حیران لگا

جتنا دل میں شور اُٹھا
دل اُتنا سنسان لگا

اِس دنیا میں جینے سے
مر جانا آسان لگا

سیرت میں بس ایک ہی شخصؐ
سر تا پا قرآن لگا

آپ کا ہنس کر ملنا بھی
اشرف کو احسان لگا

❁❁❁❁❁

کیفیت ہے یہ جسم و جان میں کیا
کوئی آیا ہے اس مکان میں کیا

دھوپ میں تم جو بھاگے پھرتے ہو
چھاؤں ڈستی ہے سائبان میں کیا

رات تم نے بھی تو سنی ہوگی
ذکر میرا تھا داستان میں کیا

مجھ کو تو اپنا آسرا بھی نہیں
آؤ گے تم مری امان میں کیا

دو دلوں میں یہ دوریاں کیسی
کوئی آیا ہے درمیان میں کیا

ایک تم سے ہی گھر کی رونق ہے
ورنہ رکھا ہے اِس مکان میں کیا

دیکھ لیتے ہو جب اُنہیں اشرف
جان آتی نہیں ہے جان میں کیا

❁❁❁❁❁

ہجر سے جو ملا کے رکھا ہے
غم وہ جگنو بنا کے رکھا ہے

تیری راہوں میں اک دیا ہی نہیں
ہم نے دل بھی جلا کے رکھا ہے

خشک آنکھوں کی اوٹ میں ہم نے
اک سمندر چھپا کے رکھا ہے

آنکھ میں جو کبھی نہیں اُترا
خواب وہ بھی بچا کے رکھا ہے

وقت کو بھی کتاب میں ہم نے
مور کا پر بنا کے رکھا ہے

ہم نے دشتِ حیات میں اشرف
ہر قدم مسکرا کے رکھا ہے

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

تو حقیقت ہے یا خیال ابھی
بوجھ دل پر ہے یہ سوال ابھی

میں کہ گم ہوں خود اپنی حیرت میں
مجھ کو مشکل میں تو نہ ڈال ابھی

چاند مانگوں میں آج کھیلن کو
میری جانب اِسے اچھال ابھی

بھولنا تجھ کو ہے کمال کی بات
میں یہ کر سکتا ہوں کمال ابھی

کوئی تعبیر مل ہی جائے گی
خواب ٹوٹے ہوئے سنبھال ابھی

پھر دعا کا دیا جلا اشرف
دل میں در آئے وہ جمال ابھی

❁❁❁❁❁

باعثِ افتخار سا کچھ ہے
دل میں نفرت، کہ پیار سا کچھ ہے

اب ضرورت نہیں ہے دشمن کی
دوست پر انحصار سا کچھ ہے

میرے پہلو میں دل نہیں شاید
درد کے خار زار سا کچھ ہے

یاد پھر کچھ نہ کچھ دلائے گا
ذہن میں جو غبار سا کچھ ہے

آج پھر دل سنبھل نہیں پایا
آج پھر بے قرار سا کچھ ہے

جو بچاتا ہے بد دعاؤں سے
میرے ہر سُو حصار سا کچھ ہے

جس پہ اب تک کھڑا ہوں میں اشرف
تخت ہے یا کہ دار سا کچھ ہے

کچھ سمندر سے کچھ ہواؤں سے
کچھ شکایت ہے ناخداؤں سے

منتظر آنکھ کا ستارہ ہے
چاند نکلا نہیں گھٹاؤں سے

کیسی منظر شناس ہیں آنکھیں
کام رکھتی ہیں بس خلاؤں سے

اپنی جانب مسافرت ، توبہ!
خون رِسنے لگا ہے پاؤں سے

اک اَنا کا حصار رکھتا ہے
مجھ کو محفوظ التجاؤں سے

مجھ پہ سایہ اُسی کا ہے اشرف
جو بچاتا ہے سب بلاؤں سے

❁❁❁❁❁

نہ راس آیا زمیں سا جو خاک دان مجھے
لگا بلانے اِشاروں سے آسمان مجھے

میں اپنے عہد کی آواز بننے والا تھا
پہ مصلحت نے مِری، رکھا بے زبان مجھے

ہوا سے لڑتے ہوئے چاہے جاں چلی جائے
بچانا ہوگا چراغوں کا خاندان مجھے

ملا نہ تُو جو کسی موڑ پر کہانی کے
ادھوری رکھنی پڑے گی یہ داستان مجھے

تِری وفا پہ یقیں ہے، مگر یہ چاہتا ہوں
کوئی تو ہو جو کرے تجھ سے بدگمان مجھے

کسی کی یاد کے آفاق میں ہوں گم ایسے
کہ اب تو ملتا نہیں میرا بھی نشان مجھے

دروغ گو نہیں ، پر مصلحت اِسی میں تھی
کسی کے حق میں بدلنا پڑا بیان مجھے

شکستہ پر بھی ہوں، منزل بھی دور ہے اشرف
مگر ارادہ اُڑاتا ہے بے تکان مجھے

غبارِ کارواں ہونے لگا ہے
وہ گزری داستاں ہونے لگا

ابھی تک آنکھ پر تھا ضبط، لیکن
یہ دریا بھی رواں ہونے لگا ہے

نہیں کچھ بھی، مگر ہونے کا اپنے
مجھے کچھ کچھ گماں ہونے لگا ہے

مری آنکھوں میں تھے آثار جس کے
وہ منظر بھی دھواں ہونے لگا ہے

یہ کیسا درد ہے جو لمحہ لمحہ
مرے دل میں جواں ہونے لگا ہے

محبت میں مرا اُس کا تعلق
مثالِ جسم و جاں ہونے لگا ہے

تصویرِ کائنات جو آئینہ رو ہوئی
اک بے وجود شکل مرے چار سُو ہوئی

پوچھا کیا جو میں نے غزل کے غزال کا
اک وادیٔ حسین مرے روبرو ہوئی

آیا نہ میرے ہونے کا تم کو کبھی یقین
بے سُود یعنی ساری مری ہاؤ ہُو ہوئی

دل سنگ میں ڈھلا تو ہوئی آنکھ ریگزار
گویا کہ مجھ میں خشک ہر اک آب جو ہوئی

خوابوں میں ہم نے خاک ملائی کچھ اِس طرح
اک روشنی سی تا بہ سحر کُو بکُو ہوئی

اشرف نہ سِل سکی کبھی ہم سے ردائے زیست
اُتنی ہے تار تار ، یہ جتنی رفو ہوئی

❁❁❁❁❁

سخن منظر بہ منظر آ رہے ہیں
نئی غزلوں کے پیکر آ رہے ہیں

کھلی آنکھوں نہ جن کو دیکھ پائے
وہی خوابوں کے اندر آ رہے ہیں

جمالِ ہم نشیں کا ذکر چھیڑو
مضامیں اور بہتر آ رہے ہیں

مرے اندر ہے ہر سو خشک سالی
نظر باہر سمندر آ رہے ہیں

زمیں پھر کربلا بننے لگی ہے
تو کیا پھر سے بہتّر آ رہے ہیں

مری وحشت کے سائے ہیں، جو اشرف
مرے قد کے برابر آ رہے ہیں

❁❁❁❁❁

رہے سفر میں شب و روز ہمرکاب مرا
مرا ستارہ، مرا ذرہ، آفتاب مرا

یہ دشتِ دل میں عجب خواہش نمو جاگی
کہ بے کراں ہوا جاتا ہے پھر سراب مرا

گرا دیا ہے ستارہ جو آنکھ سے شب نے
وہی ہے کھویا ہوا مدتوں سے خواب مرا

میں کیوں نہ کھول دوں بابِ نظر ستاروں پر
کہ منتظر ہے وہاں پر بھی ماہتاب مرا

فشارِ خوں کی طرح اپنی موج میں ہے رواں
نکل سکا نہ مگر جاں سے اضطراب مرا

بیتے ہوئے لمحوں کے خزینے سے بندھے ہیں
کچھ خواب، جو آنکھوں میں قرینے سے بندھے ہیں

باہر بھی ہے آباد نگر اپنے جنوں کا
اندر بھی کسی غم کے مدینے سے بندھے ہیں

ساحل پہ بھی ڈر ہے کہ کہیں ڈوب نہ جاؤں
کتنے ہی بھنور میرے سفینے سے بندھے ہیں

یادیں ہوں، جدائی ہو، کہ احساسِ زیاں ہو
پتھر کئی اب تک میرے سینے سے بندھے ہیں

اشرف کبھی نکلو تو سہی اُس کی طلب میں
رستے کسی منزل، کسی زینے سے بندھے ہیں

وبالِ جاں پہ بنی ہیں محبتیں کیسی
پنپ رہی ہیں دلوں میں یہ وحشتیں کیسی

وہ میرے پاس نہیں ہے، مگر خلاؤں میں
اُبھرنے لگتی ہیں جانے شباہتیں کیسی

چھلک نہ جائے کناروں سے آنکھ کا دریا
ہجومِ غم میں گھِری ہیں مسرتیں کیسی

یہ آبگینۂ جاں خود بھی ٹوٹ سکتا ہے
تو پتھروں کی تجھے ہیں ضرورتیں کیسی

رہی یہ شب تو اجالوں کی نگہداری میں
سحر کے آنے میں پھر ہیں قباحتیں کیسی

یہ دیکھتا ہے ہر اک آئینہ تحیّر سے
مرے وجود میں پنہاں ہیں حیرتیں کیسی

مرے یقین و گماں کی اساس تو دیکھو
بنائے جاتا ہوں پانی پہ صورتیں کیسی

جھلس رہا ہوں میں اپنی ہی دھوپ میں اشرف
مِلی ہیں مجھ کو ، مجھی سے یہ راحتیں کیسی

❁❁❁❁❁

غـزل کا استعـارہ ہو رہا ہے
ہـر اک ذرہ ستارہ ہو رہا ہے

بتاؤ تو خلا میں تکنے والو!
یہ کس شے کا نظـارہ ہو رہا ہے

ازل سے ہوں مکین دشتِ وحشت
مگر گھـر میں گزارہ ہو رہا ہے

فصیل جاں پہ ہـر سُو روشنی ہے
چـراغِ دل ستارہ ہو رہا ہے

پرائی صورتوں سے عشق اشرف
ہمیں گویا خسارہ ہو رہا ہے

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

دل کے دیوار و در کو دیکھا ہے ؟
اک نظر تو نے گھر کو دیکھا ہے؟

میری مٹی نے دستِ کوزہ گر !
تیرے کارِ ہُنر کو دیکھا ہے

خود سے بے گانہ ہو گیا ہوں میں
تو نے تو لمحہ بھر کو دیکھا ہے

گھر سے نکلے تو ہو ، مگر تم نے
اپنے زادِ سفر کو دیکھا ہے ؟

ہم نے اشرف بس اُس کی آنکھوں میں
آنے والی سحر کو دیکھا ہے

❁❁❁❁❁

حصارِ ذات میں آیا ہوں اِس کمال کے ساتھ
بیان کرتا ہے مجھ کو جہاں مثال کے ساتھ

شفق کے رنگ میں سرخی مرے لہو کی ہے
میں جگمگاتا ہوں افلاک پر ہلال کے ساتھ

گرا ضرور ہوں، لیکن جھکا نہیں ہوں میں
نہ دیکھ دوست مجھے اِس قدر ملال کے ساتھ

یہی سبب ہے کہیں میرا دل نہ لگنے کا
میں جُڑ گیا ہوں ترے خواب اور خیال کے ساتھ

تمام عمر کیا خود کو حل، مگر اشرف
مِلا جواب نہ میرا، کبھی سوال کے ساتھ

تیرہ شبی سے دن کا اُجالا جُدا کرو
یا میری رہ سے اپنا ستارہ جُدا کرو

تم اپنی خواہشات کے بڑھتے ہجوم سے
گر ہو سکے تو میری تمنّا جدا کرو

دیکھو، رہے نہ ساتھ مِرے، سایہ تک مِرا
مجھ سے مِرے وجود کو تنہا جدا کرو

صحرا مِرے وجود کا کرتا نہیں قبول
جو بھیک میں دیا تھا، وہ دریا جدا کرو

اشرف حصارِ ذات میں رہ کر ہے خوش بڑا
اِس کو اَنا کے خول سے زندہ جُدا کرو

ہوائے تیز کی زد میں تھا ، سو نشانہ ہوا
یہ دل ہمارا بھی گویا چراغ خانہ ہوا

تمام دشت و دمن میرے آگے آگے چلے
اور ان کے پیچھے مرا قافلہ روانہ ہوا

وہ جس کہانی میں کردار میرا کوئی نہ تھا
اُسی میں آکے مکمل مرا فسانہ ہوا

یہ کیسا خواب مری آنکھ میں اُتر آیا
روّیہ نیند کا آنکھوں سے باغیانہ ہوا

ہمارا عشق بھی اشرف خزاں گزیدہ ہے
یہ باغ وہ ہے ، کبھی جو ہرا بھرا نہ ہوا

جب فکرِ ماہ و سال سے آگے نکل گیا
مَیں وقت کے زوال سے آگے نکل گیا

چارہ گروں کے پاس کہاں عشق کا علاج
یہ زخم اندمال سے آگے نکل گیا

دریائے عشق آج تو اپنے بہاؤ میں
ہر ہجر، ہر وصال سے آگے نکل گیا

آواز دے رہے تھے حسیں لوگ ، اور مَیں
اُس وادیِ جمال سے آگے نکل گیا

مجھ کو سجائے چاک پہ بیٹھا تھا وہ، کہ میں
اُس دستِ باکمال سے آگے نکل گیا

سِکہ مرے سخی نے وہ خیرات میں دیا
جو کاسۂ سوال سے آگے نکل گیا

اِتنا لڑا ہواؤں سے اشرف مرا چراغ
آخر ہر اِک ملال سے آگے نکل گیا

❁❁❁❁❁

خواب و خواہش کے استعارے پر
جی رہا ہوں اِسی سہارے پر

میں نہیں تھا تو سب ادھورا تھا
سو ہُوا ثبت میں نظارے پر

خوش گمانی میں بہتا جاتا ہوں
یونہی ریگِ رواں کے دھارے پر

اِک نظر میرے ڈوبتے دل پر!
اِک نظر ڈوبتے نظارے پر

اب وہاں تیرگی اُترتی ہے
چاند اُترا تھا جس کنارے پر

دل کی مانند بجھتا جاتا ہے
نِگہ پڑ جائے جس ستارے پر

دل میں اُبھری اُڑان کی خواہش
میں نے جس وقت بھی اُتارے پر

ہم نے دنیا تیاگ دی اشرف
اُس حسیں آنکھ کے اِشارے پر

❁❁❁❁❁

ہزار چہرے، جو بزمِ خیال تک آئے
نہ اُس ستارہ صفت کی مثال تک آئے

اُسے تو اپنا ہنر یوں بھی آزمانا تھا
سو ہم جو خاک تھے، دستِ کمال تک آئے

ہم امتحانوں کا صحرا عبور کرتے ہوئے
دیارِ ہجر سے کُوئے وصال تک آئے

وہ جن کو حرف ونوا سے رہی ہے ضد اشرف
ہزار شُکر، کہ کچھ قیل و قال تک آئے

❁❁❁❁❁

دل کی زمیں پہ درد کا جاری نظام ہو
یا اندمالِ زخم کا کچھ اہتمام ہو

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک کا یہ سفر
تیری محبتوں کے جلَو میں تمام ہو

کب سے کھڑا ہوں آس کے اِس کوہِ طور پر
مجھ سے مرا خدا بھی کبھی ہمکلام ہو

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

یہ بھی جاں پر وبال رکھنا ہے
خود سے رِشتہ بحال رکھنا ہے

اِن مسرّت کے موسموں بھی
ہم کو دل میں ملال رکھنا ہے

ہنستا رہتا ہوں ، دنیا داری کا
کچھ نہ کچھ تو خیال رکھنا ہے

❁❁❁❁❁

❁❁❁❁❁

بزمِ خیالِ یار سجا کر تو دیکھئے
یادوں کے کچھ چراغ جلا کر تو دیکھئے

اک سیلِ نور آپ کا ہے منتظر حضور!
اِس شہرِ بے چراغ میں آ کر تو دیکھئے

یہ زندگی حباب کی صورت ہے بے ثبات
تصویر پانیوں پہ بنا کر تو دیکھئے

❁❁❁❁❁

بڑی مشکل سے اِس قابل ہوا ہوں
میں اک پتھر تھا، آخر دل ہوا ہوں

یہ کس کے لمس نے روشن کیا ہے
ستارے سے مہِ کامل ہوا ہوں

ہم اپنے چاک پہ صدیوں سے نامکمل تھے
یہ کارنامہ کسی دستِ بے ہُنر کا تھا

غزل شاید اُردو اَدب کی واحد صنفِ سخن ہے جو جس قدر خوب صورت ہے، اُس سے زیادہ خوش بخت ہے کہ گزشتہ تین سو برس میں شاید ہی کوئی ایسا زمانہ ہو جب اِس میں تازہ اور صحت مند خون کی آمد کا تسلسل ٹوٹا ہو۔ اِس کی ایک زندہ مثال اشرف نقوی کا یہ مجموعۂ کلام ہے جس کی غزلوں سے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کسی ''تازہ وارد'' کا کلام ہے۔ موضوعات کا انتخاب، فکری تازگی، فنی گرفت، اظہار کی قوت اور بے ساختگی اور ردیفوں کا ماہرانہ استعمال ایسا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر چونکتا بھی ہے اور ایک ایسی جذباتی آسودگی بھی محسوس کرتا ہے جو کسی بھی اچھے فن پارے کے اندر خون کی طرح گردش کرتی رہتی ہے۔

کسی بھی نوجوان شاعر سے یہ توقع رکھنا کہ اُس کا سارا تخلیقی جوہر ابتدا ہی میں اپنے امکانات کو تفصیل سے ظاہر کر دے گا، ایک خلافِ عقل بات ہے کہ فنکار کا تخلیقی ارتقاء وقت کے ساتھ نہ صرف نئے امکانات دریافت کرتا ہے بلکہ اپنے مخصوص لہجے اور طرزِ فکر کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ اشرف نقوی کو بھی ہر اچھے اور فطری شاعر کی طرح اس امتحان سے گزرنا ہوگا۔ فی الوقت جو چیز اسے اپنے ہم عصروں میں ممتاز کر رہی ہے وہ اُس کی اُٹھان کا انداز ہے۔ جہاں تک اُس کے پروں کی طاقت اور آئندہ موسموں کا تعلق ہے اس کا حساب اپنے وقت پر ہوگا۔ البتہ ایک اچھے آغاز کی داد اُس کا حق ہے جو اُسے ملنا چاہیے۔

امجد اسلام امجد

۱۹ فروری، ۲۰۰۶ء